(۲) دوسرے یہ کہ ہندوستان کے انیسویں صدی کے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے نامور شیخ اور عظیم ترین مفسر، محدّث اور فقیہہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی ؒ (صاحب تفسیر مظہریؒ) نے اپنی مشہورِ زمانہ تالیف ''مـا لا بُـدّ مـنـہ'' میں صاف تحریر فرمایا ہے کہ ''چونکہ اس ملک میں زمینیں عُشری نہیں (بلکہ خراجی) ہیں، لہٰذا اس کتاب میں عُشر اور عاشر (یعنی عُشر وصول کرنے والے تحصیل داروں) کے احکام بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!''

واضح رہے کہ یہ کتاب فقہ حنفی کے قاعدے یا پرائمر کی حیثیت سے تمام مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہے۔

آخر میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت بینچ کے متذکرہ بالا فیصلے پر جو فاضلانہ تبصرہ ملک کے ایک ماہر قانون دان جناب سردار شیر عالم صاحب نے کیا ہے، جو پاکستان لاء جرنل کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۹۳ء میں ''قرارداد مقاصد اور عدلیہ کا کردار!'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس کے حسب ذیل دو افتتاحی اور اختتامی جملے ہدیۂ قارئین ہیں:

(1) ***"In Qazilbash Waqf case, the Land Regulation of 1972 and Land Reforms Act of 1977 which fixed the ceiling for land holding were struck down on the basis of repugnency to Islam. The court broke through the protective stonewall erected by Articales 253, 8(3), (24), 268 (2), 269 and reinforced by Article 203B (c) of the Constitution."***

(2) ***"Now the situation is that the judicial pronouncement of the Supreme Court has struck down the land reforms as un-Islamic and thus defeated the operation of so many constitutional provisions including 253 (2). But it remains an open question even now as to which one should prevail, the effect of a constitutional provision i.e. 253(2) or the effect of judicial pronouncement."***

کاش کہ سپریم کورٹ آف پاکستان اپنے اس فیصلے پر از خود نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کرے۔ اللّٰھم آمین!

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

اسلام کے دو معاشی نظام

سماجی انصاف کے ضمن میں عہد حاضر میں معاشی عدل کی اہمیت اور اس سلسلے میں خاص طور پر پاکستانی معاشرے سے جاگیرداری‘ غیر حاضر زمینداری اور مزارعت کے خاتمے کی بحث کے ضمن میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معاشی اور اقتصادی معاملات کے بارے میں شریعتِ اسلامی کے احکام کی پشت پر جو بنیادی اصول کارفرما ہیں انہیں اچھی طرح سمجھ لیا جائے‘ تاکہ ان کے پس منظر میں شریعت کے احکام کی حکمتیں سامنے آ سکیں اور ذہن وقلب میں انشراح پیدا ہو سکے۔

اسلام نے معاشی اور اقتصادی معاملات میں عدل وقسط کا جو مقام متعین کیا ہے‘ جس میں اس نے مساوات اور آزادی ایسی بظاہر متضاد اقدار کو نہایت خوبصورتی اور توازن سے سمو دیا ہے اس کے بارے میں یہ بات شاید اکثر لوگوں کو چونکا دے (اور یہی میں چاہتا ہوں تاکہ ذہن بیدار ہو جائیں) وہ یہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام ایک نہیں دو ہیں‘ اور دونوں اپنی اپنی جگہ از ابتدا تا انتہا مکمل ہیں۔ چنانچہ دونوں کا اپنا اپنا فلسفہ ہے‘ دونوں کا مختلف نظریۂ ملکیت‘ نظریۂ حقوق اور نظریۂ قدرِ زائد (Surplus value) ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہی چیزیں کسی معاشی نظام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ جملہ امور اِن دونوں میں بالکل جدا جدا ہیں۔

اسلام کے ان دونوں معاشی نظاموں کو کوئی چاہے تو یوں کہہ لے کہ یہ دونوں ایک ہی نظام کے دو رُخ ہیں‘ لیکن بہرحال ان کے علیحدہ علیحدہ وجود سے انکار ممکن نہیں۔ البتہ یہ دونوں نظام ایک دوسرے سے interconnected (باہم مربوط) بھی ہیں اور بہت حد تک interdependent بھی۔ اور اسلام کی اصل برکات اور اس کے جملہ ثمرات کا کامل ظہور ان دونوں کے اجتماع اور اتصال ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اگر ان دونوں میں سے ایک پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو

© rasailojaraid.com

جائے اور توجہ صرف دوسرے پر مرکوز ہو جائے تو اس سے جو تصویر سامنے آئے گی وہ اصل حقیقت سے بہت دُور ہوگی۔ ان میں سے ایک اسلام کا روحانی واخلاقی نظام ہے اور دوسرا قانونی وفقہی نظام۔ اور ان دونوں کے تقاضے بسا اوقات مختلف ہی نہیں متضاد ہوتے ہیں۔ تاہم ان دونوں کے امتزاج سے اسلام کا کامل نظام وجود میں آتا ہے۔ آپ چاہیں تو ان دونوں پہلوؤں کو ''دعویٰ''(Thesis) اور ''جوابِ دعویٰ'' (Anti-Thesis) سے تعبیر فرمالیں اور اسلام کے مجموعی اقتصادی نظام کو ان دونوں کا امتزاج(Synthesis) قرار دے لیں۔

اسلام کی قانونی اور اخلاقی تعلیمات کے مابین جو فرق و تفاوت بہت سے معاملات میں موجود ہے' وہ ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال سے واضح ہو جائے گا۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص آپ کو ایک تھپڑ مار دے تو اگر آپ بالکل ہی عاجز و کمزور ہوں تو اس صورت میں تو ظاہر ہے کہ ''قہرِ درویش برجانِ درویش'' کے سوا اور کوئی صورت قابل عمل ہے ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہوں تو آپ کے سامنے دوراستے کھلے ہوں گے: ایک یہ کہ آپ بدلہ لے لیں اور دوسرے یہ کہ آپ معاف کر دیں۔ اس صورت میں ایک جانب اسلام کا قانونی اور فقہی نظام ہے جو بدلے اور قصاص کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰـاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرۃ: ۱۷۹) یعنی ''اے ہوش مندو! تمہارے لئے قصاص ہی میں زندگی ہے!'' لیکن دوسری طرف اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام ہے جو عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے' یعنی اگر معاف کر دو تو یہ تقویٰ اور خدا ترسی سے قریب تر ہے۔ چنانچہ کہیں تو شوق اور رغبت دلانے کے انداز میں فرمایا جاتا ہے ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط﴾ (آل عمران: ۱۳۴) یعنی ''وہ لوگ جو غصہ کو پی جائیں اور لوگوں کو معاف کر دیا کریں۔'' اور کہیں اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں ترغیب دی جاتی ہے کہ ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (التغابن: ۱۴) یعنی ''اگر تم معاف کر دیا کرو' اور چشم پوشی سے کام لو' اور خطائیں بخش دیا

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

کرو تو یقیناً اللہ بھی غفور و رحیم ہے!''——— دیکھ لیجئے کہ عفو و قصاص ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں' لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ ان دونوں میں سے صرف ایک پر استوار ہو سکتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقام پر لازم و ناگزیر ہیں اور حسنِ معاشرت ان دونوں کے امتزاج ہی سے وجود میں آتا ہے۔

اس پر قیاس کر کے سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کے معاشی نظام کے بھی دو پہلو ہیں' چنانچہ ایک جانب قانونی اور فقہی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ ایک نوع کی محدود (Controlled) اور داخلی طور پر منضبط (Internally managed) سرمایہ داری (Capitalism) ہے' اس لئے کہ اس میں انفرادی سرمایہ کاری کی اجازت موجود ہے' اگرچہ اسے ''سرمایہ دارانہ نظام'' بننے سے بعض تحدیدی اقدامات نے روک دیا ہے۔ دوسری طرف اسلام کا روحانی و اخلاقی نظامِ معیشت ہے جس کے بارے میں پورے انشراحِ صدر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی روحانی اشتراکیت (Spiritual Socialism) ہے اور ایک ایسا کامل سوشلزم ہے کہ اس سے بلند تر سوشلزم کا تصور ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ سوشلزم یا کمیونزم میں تو پھر بھی انسانی ملکیت کا اثبات موجود ہے' اگرچہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی' لیکن اسلام اپنی اخلاقی و روحانی اور صحیح تر الفاظ ''ایمانی تعلیم'' کی رو سے انسانی ملکیت کی کلی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں کہ ﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس سب کا مالک صرف اللہ ہے''۔ چنانچہ انسان کسی اور شے کا مالک تو کیا ہو گا' خواہ وہ زمین ہو یا مکان' اور ساز و سامان ہو یا روپیہ پیسہ' وہ تو خود اپنا اور اپنے وجود کا مالک بھی نہیں' اس کے ہاتھ پاؤں' اعضاء و جوارح اور جسم و جان اور اس کی کُل صلاحیتیں اور توانائیاں سب اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان کا امین ہوں۔ بقول شیخ سعدی ؒ

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
درحقیقت مالکِ ہر شے خداست

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

یا بقول علامہ اقبال ؎

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

اس اعتبار سے ہمارے ہاں بڑا کنفیوژن پایا جاتا ہے۔ سوشلسٹ ذہن رکھنے والے اہلِ قلم متذکرہ بالا مضمون کی آیات اور احادیث کو اکٹھا کر کے ہر شے کی ملکیت کی بھی کامل نفی کرتے رہے ہیں اور ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھنے کی بھی' کہ جب ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ (البقرہ:۲۱۹) فرمادیا گیا' یعنی جتنا ضرورت سے زائد ہے اللہ کی راہ میں دے ڈالو۔ تو زائد چیز جبراً بھی وصول کر لی جائے گی۔ اس طرح وہ ایک کامل اسلامی سوشلزم کا نقشہ پیش کرتے رہے جب کہ دوسرے پہلو کو بالکل نظر انداز کرتے رہے۔ حالانکہ قانونِ وراثت بھی اسی قرآن میں موجود ہے' اور حضور اکرم ﷺ نے جو نظام برپا کیا تھا اس میں کہیں جبری مساوات دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ اس کے برعکس آزاد معیشت کے مواقع دیئے گئے تھے' کہ محنت کرو اور جائز ذرائع سے کماؤ' اور ان ذرائع سے تم جو کچھ کماؤ گے اس پر تمہارا حقِ تصرف یہاں تک تسلیم کیا جائے گا کہ اس کو وراثت میں منتقل بھی کیا جا سکے۔ دوسری طرف ہمارے ہاں بعض مفکرین اور اصحابِ قلم نے صرف اس قانونی نظام کو اتنا نمایاں کیا ہے کہ دوسرا پہلو دب کر رہ گیا ہے۔ یعنی ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ کی آیت ان کی تقریر و تحریر میں آتی ہی نہیں!

یاد رہے کہ یہ کنفیوژن (الجھن) پورے خلوص کے ساتھ محض غلط فہمی کی بنیاد پر بھی ہو سکتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ غلط فہمی ہمارے دورِ اوّل یعنی خلافتِ راشدہ کے دوران بھی پیدا ہو گئی تھی' چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے غلبۂ زہد کے باعث یہ رائے قائم کر لی تھی کہ ضرورت سے زائد اشیائے صرف اور کسی بھی مقدار میں سونا اور چاندی اپنے پاس رکھنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ گویا آپؓ نے آیۂ کنز یعنی سورۃ التوبہ کی آیت ۳۴:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ٥﴾

© rasailojaraid.

''جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے!''

کو بالکل اس کے ظاہری الفاظ پر محمول کیا۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے اس نظام میں جس پر تمام اُمت جمع تھی' اس رائے کو ایک انتہا پسندانہ موقف قرار دیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انہیں مدینہ منورہ سے باہر چلے جانے کی ہدایت بھی کی گئی۔ لہٰذا انہوں نے ایک بیابان میں جھونپڑا ڈالا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے احساس کی شدت کا یہ عالم تھا کہ وفات کے قریب آپؓ نے اپنی زوجہ محترمہ سے فرمایا کہ ''میرے خلیل (یعنی نبی اکرم ﷺ) نے فرمایا تھا کہ مسلمانو! تم اپنے اردگرد سانپ بچھو (یعنی سامانِ تعیش) جمع کرلو گے۔ افسوس کہ ہم نے بھی سانپ اور بچھو اپنے گرد جمع کر لئے ہیں''۔ تو انہوں نے کہا کہ کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو؟ تو آپ نے معمولی چیزوں جیسے توا' چمٹا اور دیگچی کا حوالہ دے کر کہا: یہ نہیں پڑے ہوئے میرے گرد! حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اسی غلبۂ زہد کی وجہ سے آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''تم میں سے جو چاہے کہ حضرت عیسٰیؑ کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اسے چاہئے کہ وہ میرے دوست ابوذرؓ کو دیکھ لے''۔ بہرحال یہ نظامِ اسلامی کا وہ روحانی پہلو ہے جس کی طرف اسلام انسانوں کو ترغیب تو دینا چاہتا ہے کہ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے تزکیہ اور روحانی مراتب کے حصول کے لئے آگے بڑھ سکتا ہے' مگر اس کو قانونی درجہ دے دینا ایک مغالطہ تھا جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ لاحق ہوا۔ لیکن عہدِ حاضر میں یہ مغالطہ جان بوجھ کر اور بدنیتی کے ساتھ دیا جاتا رہا ہے' کیونکہ آج تو خلافتِ راشدہ کا نظام پورے کا پورا ہمارے علم میں موجود ہے اور اُمت کے اس اجماعی فیصلے کو بغیر بدنیتی کے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

بہرحال اسلام کے اس روحانی معاشی نظام کے چار اصول ذہن میں اچھی طرح مرتب اور مستحضر کر لئے جائیں:

۱) انسانی ملکیت کی کلی نفی۔

© rasailojaraid
© rasailojaraid

۲) یہ یقین کہ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے اس کی کمائی نہیں، اللہ کا فضل ہے۔ گو دکان پر وہ بیٹھا ہے، کھیت میں ہل اس نے چلایا ہے، محنت اس نے کی ہے، لیکن ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہے اس کو اللہ کا عطیہ اور اس کا فضل سمجھو۔ اگر اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھو گے تو اس پر اپنا حق ملکیت جتاؤ گے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم بھی وہی سمجھو گے جو قوم شعیبؑ نے سمجھا تھا کہ ﴿اَنْ نَّفْعَلَ فِیْ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا﴾ (ہود: ۸۷) یعنی یہ کہ ہمیں اختیار ہونا چاہئے کہ اپنے مال میں جیسے چاہیں تصرف کریں لیکن اگر اللہ کا فضل سمجھو گے تو اس میں تصرف بھی اصل مالک اور عطا کنندہ کی مرضی کے مطابق کرو گے۔

۳) اللہ کے اس ''فضل'' میں سے انسان کا جائز حق صرف اس کی ضروریات کے بقدر ہے، اور ان بنیادی انسانی ضرورتوں کو بھی بعض احادیث میں متعین کر دیا گیا ہے یعنی:

ا: اگر دو وقت کھانے کے لئے مل گیا ہے۔

ب: سر چھپانے کے لئے اگر کوئی چھت موجود ہے۔

ج: پہننے کے لئے اگر دو جوڑے کپڑوں کے موجود ہیں۔ اور

د: اپنے کردار، اخلاق اور عفت کی حفاظت کے لئے اگر ایک بیوی بھی موجود ہے تو تمہارا بنیادی حق تمہیں مل گیا۔

۴) اس بنیادی ضرورت سے زائد جو کچھ ہے اس کے بارے میں اخلاقی یا روحانی سطح پر اسلامی کی تعلیم یہ ہے کہ وہ خواہ قانونی اعتبار سے تمہارا ہو، حقیقت کے اعتبار سے تمہارا نہیں، دوسروں کا حق ہے۔ اس کو اُن لوگوں تک پہنچا دو جن کے پاس بنیادی ضرورت کے بقدر بھی موجود نہیں ہے اور پھر سمجھو کہ تم غریبوں کی اس امانت کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے جو تمہارے امتحان کی غرض سے تمہارے مال میں شامل کر دی گئی تھی۔

الغرض، یہ ہے وہ مقام جہاں ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ کا فلسفہ بندۂ مؤمن کو پہنچانا چاہتا ہے،

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

یعنی یہ کہ تمہارے پاس جو بھی ''قدرِ زائد'' ہے اس کو مزید کمائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ تمہاری ضرورت پوری ہو گئی تو تمہارا حق مکمل ہو گیا' اب جو زائد تمہارے پاس ہے وہ خواہ قانوناً تمہارا ہو مگر حقیقتاً تمہارا نہیں ہے۔

بہرحال یہ ایک مکمل معاشی نظام ہے۔ اس میں ملکیت اور قدرِ زائد کا اپنا جداگانہ تصور ہے' اور اس قدرِ زائد کا مصرف بھی طے شدہ ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے خود اسی نظام کے مطابق زندگی بسر کی تھی۔ چنانچہ یہ بات بہت سے لوگوں کے لئے جنہوں نے اس سے قبل ان معاملات پر غور نہ کیا ہو' بہت حیران کن ہو گی کہ نبی اکرم ﷺ نے تمام عمر ''زکوٰۃ'' ادا نہیں کی۔ اس لئے کہ زکوٰۃ تو ظاہر ہے کہ صرف صاحبِ نصاب پر عائد ہوتی ہے اور آپؐ نے کبھی کوئی درہم و دینار اپنے پاس رکھا ہی نہیں کہ اس کی نوبت آ سکتی۔ لیکن یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اس نظام کی ساری خوبی اور اس کا کُل حسن اس کے ''رضاکارانہ'' (voluntary) ہونے میں مضمر ہے۔ اسے کسی ادنیٰ درجہ میں بھی بالجبر نافذ کرنے کی کوشش کی جائے تو نتیجہ وہی نکلے گا جو کمیونزم کے حشر کی صورت میں سامنے آ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ہمیں دونوں طرح کے حضرات نظر آتے ہیں۔ وہ بھی جنہیں عرفِ عام میں فقراءِ صحابہ کہا جاتا ہے' جنہوں نے اسی ''اختیاری فقر'' کے نظام کو عملاً اختیار کیا جن کے سرخیل حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تھے' اور وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنا عام چلن تو اسلام کے قانونی اور فقہی نظام کے مطابق رکھا جس سے ان کے پاس سرمایہ جمع بھی ہوا' لیکن جب بھی جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کے لئے ضرورت پیش آئی انہوں نے اپنا مال حاضر کر دیا۔ دورِ صحابہؓ کے بعد اسی ''اختیاری فقر'' اور ''رضاکارانہ سوشلزم'' پر صوفیائے کرام کا عمل رہا۔ اور کون نہیں جانتا کہ دورِ صحابہؓ کے بعد اسلام کی تبلیغ و توسیع کا سارا معاملہ ان ہی حضرات کی مساعی کا مرہونِ منت ہے۔

قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایمانی اور روحانی سطح پر قرآن کی معاشی تعلیمات پر غور و فکر کے ضمن میں سورۃ الروم کی آیت ۳۹ بہت

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid